© rasailojaraid.com

ابوالکلام آزاد

محبت اور قربانی یا سزا اور انتقام؟

وکٹر ہیوگو کا ''بشپ'' اور تاریخِ اسلام کا ''بغدادی''

خاکسار نے اپنے قیامِ مصر میں وکٹر ھیوگو کی شہرۂ آفاق کتاب "Les Miserables" کا عربی ترجمہ 'البوساء' ۱۹۵۶ء یا ۱۹۵۷ء میں پڑھا تھا۔ یہ عربی ترجمہ مصر کے معروف شاعر حافظ ابراہیم کے قلم سے تھا۔ حسنِ اتفاق دیکھئے کہ انہی دنوں میں مجھے علی گڑھ سے ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کے چند پرچے ملے، جو ہمارے مرحوم دوست ڈاکٹر محمد اقبال انصاری نے بھیجے تھے۔ ان میں اس شہرۂ آفاق کتاب پر ابوالکلام آزاد کا یہ مقالہ بھی تھا: ''محبت اور قربانی یا سزا اور انتقام؟

وکٹر ہیوگو کا 'بشپ' اور تاریخِ اسلام کا 'بغدادی'''

وکٹر ھیوگو کے افسانے اور ابوالکلام آزاد کے ترجمہ و بیان نے پڑھنے والوں کو مسحور کر دیا۔ گزشتہ دنوں اسی افسانے کو ایک انگریزی کتاب "The Story of Les Miserables" میں آئی۔ فورٹی (Isabel Fortey) کے قلم سے پڑھا۔ واقعہ یہ ہے کہ وکٹر ھیوگو کے افسانے اور ابوالکلام کے ترجمہ و تبصرہ سے انسانی روح کو ''نئی زندگی'' ملتی ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ ''المعارف'' کے پڑھنے والے وکٹر ھیوگو اور ابوالکلام آزاد کی تحریروں سے لطف اندوز ہوں گے۔

[ایڈیٹر]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

درسِ وفا اگر بود زمزمۂ محبتی
جمعہ بہ مکتب آورد طفل گریز پای را

(۱)

انگریزی تعلیم یافتہ اشخاص میں بہت کم لوگ ہوں گے جنھوں نے فرانس کے مشہور انشا پرداز وکٹر ہیوگو کی مصنفات کے انگریزی ترجمے نہ پڑھے ہوں۔ نثر میں اُس کی بہترین کتاب لا میزیریبل (Les Miserables) تسلیم کی گئی ہے۔ اس قصہ میں اس نے دکھایا ہے کہ انسانی زندگی کی تمام شقاوتیں اور مصیبتیں صرف اس لیے موجود ہیں کہ سوسائٹی کا نظام اور اخلاق غلط ہے۔ اس کے پاس رحم، محبت، عفو اور اصلاح کے لیے تو کوئی جذبہ نہیں لیکن وہ قانون اور سزا پر پورا اعتقاد رکھتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ انسان کو جرم اور مصیبت سے بچانے کے لیے وہ کچھ نہیں کر سکتی۔ لیکن جرم پر سزا دینے اور مصیبت پر نفرت کرنے کے لیے ہر وقت طیار (تیار) رہتی ہے!

ایک شخص جو اپنی یا اپنے عزیزوں کی بھوک سے عاجز آ کر چوری کرتا ہے، یا نیکی اور خدا پرستی کی تعلیم نہ ملنے کی وجہ سے گنہگار ہو جاتا ہے، اُسے کتنی ہی سزائیں دی جائیں، وہ جرم کرتا ہی رہے گا۔ کیونکہ سزا نے نہ تو اس کی بھوک کا علاج کیا، نہ اس کی روح کی تاریکی کے لیے نیکی کی روشنی بہم پہنچائی۔ اس کا علاج رحم اور محبت ہے۔ مگر یہی چیز سوسائٹی کے پاس نہیں ہے!

وہ کہتا ہے، جرم اور گناہ روح کا زخم ہے۔ یہ محبت کے مرہم ہی سے اچھا ہو سکتا ہے۔ لیکن دُنیا کے پاس مرہم نہیں ہے۔ صرف سزا کا تازیانہ ہے!

اس قصہ میں ایک نہایت ہی موثر سیرۃ (کیریکٹر) ایک قصبہ کے بشپ (بڑے پادری) کی ہے، اور اسی سے قصہ شروع ہوتا ہے۔ یہ بشپ رحم اور محبت کا پیکر تھا۔ انسان کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شقاوت اور مصیبت کے لیے اس کے دل میں نفرت کی جگہ رحمت تھی۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر نہ تھا کہ انسانی روح نفرت و بغض سے نہیں بلکہ محبت اور فیاضی سے شکار کی جاسکتی ہے۔ وہ اپنی تمام بیش قرار تنخواہ بے نواؤں کی اعانت اور بیماروں کی تیمارداری میں خرچ کرڈالتا اور کہتا ''یہ میرے گھر کا خرچ ہے۔'' وہ اپنا تمام وقت ابناء جنس کی خبر گیری و خدمت میں صرف کر دیتا اور کہتا ''یہ میرے اوقات کی تقسیم ہے۔'' جب کبھی کوئی بیمار پڑتا، یہ اس کے سرہانے پہنچ جاتا۔ جب کبھی کوئی مصیبت میں مبتلا ہوتا، یہ اس کے دروازہ پر دستک دیتا۔ جب کبھی کوئی مجرم گرفتار ہوتا، یہ اسے توبہ وانابت کی تسکین دینے میں مشغول نظر آتا!

اُس کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا۔ ہر آنے والے کے لیے وہ ایک ہی آواز رکھتا تھا۔ ''اندر چلے آؤ'' اس کی راتیں خدا کے تصور میں بسر ہوتی تھیں اور دن اس کے بندوں کی محبت میں!

اُسی زمانہ میں ایسا اتفاق ہوا کہ فرانس کا ایک مشہور مجرم اٹھارہ برس کی سزا جھیل کر تولون کے قید خانہ سے رہا ہوا اور اسی قصبہ سے گزرا۔ جاڑے کا موسم تھا۔ ایک پہر رات گزر چکی تھی۔ بھوک اور تھکن سے چور چور ہو رہا تھا۔ سارے قصبہ کا بار بار چکر لگایا کہ رات بھر کے لیے کہیں پناہ مل جائے مگر میسر نہ آئی۔ وہ ایک رہا شدہ قیدی تھا۔ کون تھا جو ایسی قابلِ نفرت مخلوق کو اپنی چھت کے نیچے دیکھنا گوارا کرتا؟ مجبوراً اس نے ایک احاطہ کی شکستہ کوٹھری میں پناہ لی، لیکن وہ کتے کا گھر تھا۔ کتے نے بھی گوارا نہ کیا کہ اس کے ساتھ شب باش ہو! پھر اس نے سوچا، میرے لیے صرف قید خانہ ہی میں جگہ نکل سکتی ہے۔ وہ قصبہ کے قید خانہ کے دروازہ پر پہنچا اور بڑی عاجزی سے درخواست کی کہ رات بھر کے لیے اسے جگہ دے دی جائے۔ لیکن دروازہ کے محافظ نے کہا ''یہ سرائے نہیں ہے، قید خانہ ہے۔ اگر یہاں آنا چاہتے ہو تو پہلے اپنے کو گرفتار کراؤ۔''

افسوس بدقسمت انسان! قید خانہ بھی اسے پناہ نہیں دے سکتا، جب تک وہ جرم نہ کرے!

آخر اتفاقات اُسے بشپ کے دروازہ پر پہنچاتے ہیں۔ حسبِ معمول آواز آتی ہے،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

''اندر چلے آؤ۔'' یہ مکان میں جاتا ہے اور اپنی داستانِ مصیبت سناتا ہے۔ بشپ ایک دوست اور بھائی کی طرح اس کا خیر مقدم کرتا ہے اور اپنے اور اپنے خاندان کے ساتھ میز پر بٹھا کر کھانا کھلاتا ہے۔ گرم کمرہ، گرم غذا، آرام و عافیت سے رات بسر کرنے کا سامان، صورتِ حال کی یہ تبدیلی جین والجین کی طبیعت میں (کیونکہ رہا شدہ قیدی کا یہی نام تھا) شگفتگی پیدا کر دیتی ہے۔ وہ بشپ سے بے تکلف ہو کر باتیں کرنے لگتا ہے۔ لیکن وہ سخت متعجب ہوتا ہے۔ جب دیکھتا ہے کہ بشپ اسے گفتگو میں ''جناب'' کر کے مخاطب کرتا ہے۔ اس نے اپنی زبان سے لاکھوں مرتبہ دوسروں کو ''جناب'' کہا تھا، لیکن خود اپنے لیے یہ لفظ کبھی نہیں سنا تھا۔ اُس کی ساری عمر قید خانے کے سپاہیوں کی گالیاں سننے میں بسر ہوئی تھی۔ وہ حیران ہو کر کہتا ہے ''مَیں ایک رہا شدہ قیدی ہوں۔ اگر تم میرے حال سے واقف ہوتے تو ایسا نہ کہتے۔'' لیکن بشپ کہتا ہے ''مَیں تم سے واقف ہوں۔ کیونکہ تم میرے بھائی ہو۔''

کھانے کے بعد وہ جین کے لیے اپنے کمرے کے ساتھ کا کمرہ طیار (تیار) کرا دیتا ہے۔ چاندی کا شمع دان روشنی کے لیے رکھ دیتا ہے اور شب بخیر کہہ کر رخصت ہو جاتا ہے۔

جین شکرگزار ہو کر سو جاتا ہے۔ عمر بھر میں یہ پہلا موقع تھا کہ قید خانہ کے سخت اور ٹھنڈے فرش کی جگہ ایک نرم اور گرم بستر سے اس کا جسم مس ہوا تھا!

اب ایسا ہوتا ہے کہ پچھلے پہر اس کی آنکھ کھلتی ہے۔ اس کا دماغ جو شام کی مصیبتوں سے تھک کر معطل ہو گیا تھا، کئی گھنٹے آرام پا کر اپنی اصلی حالت میں واپس آ جاتا ہے اور اپنا گرد و پیش سوچنے لگتا ہے۔ اچانک اس کے خیالات میں جنبش ہوتی ہے۔ طمع و حرص کے مجرمانہ جذبات بھڑک اُٹھتے ہیں۔ جرم کا ذوق خفتہ بیدار ہو جاتا ہے۔ اسے یاد آتا ہے کہ کھانے کی میز پر چاندی کے قیمتی برتن موجود تھے جو اسی کمرے میں ایک جگہ رکھے ہوئے ہیں۔ وہ اُٹھتا ہے۔ پہلے بشپ کے کمرے میں جاتا ہے۔ نہیں معلوم جرم و گناہ کے کیسے خوفناک ارادے اس کے اندر کھول رہے تھے؟ لیکن جب بشپ کے ساکن اور نورانی چہرے پر نظر پڑتی ہے تو جھجک کے رہ جاتا ہے۔ گھبراہٹ میں جلد جلد چاندی کے برتن اُٹھاتا ہے، اور باغ کی دیوار پھاند کر روانہ ہو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جاتا ہے۔

بشپ صبح اُٹھتا ہے۔ وہ خیال کرتا ہے کہ اپنے مہمان کے لیے گھر کی گائے کا تازہ دودھ مہیا کرے۔ لیکن اتنے میں خادمہ آتی ہے اور خبر دیتی ہے کہ یہ ''مہمان عزیز'' چاندی کے تمام برتن لے کر بھاگ گیا۔ بشپ سنتا ہے، لیکن اُس کی زبان سے شکایت کا ایک حرف نہیں نکلتا۔ وہ کہتا ہے، لکڑی یا لوہے کے برتن بھی اُسی طرح کام دے سکتے ہیں جس طرح چاندی کے برتن، وہ بہ آسانی مہیا کر لیے جائیں گے!

اتنے میں دروازہ کھلتا ہے اور پولیس کے سپاہی جین والجین کو گردن سے پکڑے نمودار ہوتے ہیں۔ اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ صبح یہ قصبہ سے نکل کر تیزی سے بھاگا جا رہا تھا۔ پولیس کے ایک سپاہی کو شبہ ہوا اور گرفتار کر لیا۔ شبہ کی تصدیق اُس بقچہ سے ہوئی جو اس کی بغل میں تھا۔ اس سے چاندی کے قیمتی برتن نکلے۔

یہی موقعہ بشپ کی سیرۃ (کیریکٹر) کی سب سے زیادہ موثر تصویر پیش کرتا ہے۔ جونہی بشپ کی نظر جین پر پڑی، بے تامل آگے بڑھا:

''میرے دوست کیا تم ہو؟'' بشپ نے کہا ''میں تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ لیکن یہ کیا بات ہے کہ تم جاتے ہوئے اپنے شمع دان یہیں چھوڑ گئے؟ حالانکہ وہ بھی تو چاندی کے ہیں۔'' اس نے چاندی کے لفظ پر زور دیا ''اور کم سے کم دو سو روپیہ میں فروخت ہو جا سکتے ہیں؟''

پولیس افسر ایک دوسرے ہی طرح کے معاملہ کا متوقع تھا۔ یہ صورتِ حال دیکھی تو گھبرا گیا:

''تو کیا وہ بات ٹھیک تھی۔'' پولیس افسر نے متعجب ہو کر کہا ''جو اس شخص نے ہم سے بیان کی تھی؟ جب ہم نے اس سے دریافت کیا کہ یہ قیمتی سامان تمہیں کیونکر ملا؟ تو اس نے کہا کہ...''

بشپ نے اس کی بات ختم ہونے کا انتظار نہیں کیا۔ خود ہی یہ کہہ کر پوری کر دی:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

''اُس نے کہا کہ یہ چیز مجھے ایک بوڑھے پادری نے دی تھی جس کے یہاں مَیں نے رات بسر کی تھی، مگر تم نے اس کی بات باور نہ کی اور گرفتار کر کے میرے پاس لے آئے۔ کیوں؟ یہی بات ہے؟ اگر یہی بات ہے تو تم نے غلطی کی۔''

پولیس افسر نے جین کو چھوڑ دیا۔ جین کی کند اور اکھڑ طبیعت کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ اس لطیف مگر حیرت انگیز طرزِ عمل کی نزاکت محسوس کر سکتا۔ صورتِ حال کی عجیب، غیر متوقع، اور انقلابی نوعیت نے اسے مبہوت کر دیا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں مگر اسے کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بشپ اُٹھا اور چاندی کے دونوں شمع دان جو اس کی چوری سے بچ رہے تھے، اُٹھا کر سامنے کر دیے:

''میرے دوست! یہ اپنی چیز لے لو اور خدا کے امن اور سلامتی کے ساتھ جاؤ۔ مگر دیکھو، جب کبھی تم واپس آؤ، تو یاد رکھنا، تمہارے لیے بالکل غیر ضروری ہے کہ باغ میں سے گزرنے کی زحمت برداشت کرو۔ تم اس گھر میں ہمیشہ اس کے صدر دروازے سے داخل ہو سکتے ہو، رات ہو یا دن۔ وہ کبھی اندر سے بند نہیں کیا جاتا۔ صرف بھڑا دیا جاتا ہے۔''

جین نے بغیر اس کے کہ صورتِ حال سمجھ سکا ہو، ایک ایسے آدمی کی طرح جو اپنے ہوش وحواس میں نہ ہو، ہاتھ بڑھا دیا اور شمع دان لے لیے۔ اب بشپ ایک قدم آگے بڑھتا ہے اور جین کے کان میں کہتا ہے:

''دیکھو یہ نہ بھولنا کہ تم نے مجھ سے آج کیا وعدہ کیا ہے؟ تم نے وعدہ کیا ہے کہ اس سامان کی قیمت سے ایک راست باز آدمی کی زندگی بسر کرو گے۔''

جین نے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ وہ تو مبہوت اور دم بخود کھڑا تھا۔ بشپ نے اس کے کہنے کا انتظار نہیں کیا۔ اُسے جو کہنا چاہیے تھا، وہ خود ہی اس کی طرف سے فرض کر لیا۔ قبل اس کے کہ منظر ختم ہو، بشپ کی زبان پھر کھلتی ہے۔ وہ جین کے کاندھے پر شفقت سے ہاتھ رکھتا ہے اور کہتا ہے:

''جین والجین، میرے دوست! میرے عزیز بھائی! اب تم زیادہ عرصہ تک برائی کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زندگی میں نہیں رہ سکتے۔ مَیں نے آج تمہاری روح تم سے خرید لی ہے۔ مَیں اُسے تاریکی سے نکال کر خدا کے حوالہ کرتا ہوں!"

مَیں نے جب کبھی قصہ کا یہ حصہ پڑھا ہے، تو محسوس کیا ہے کہ کوئی چیز ضرورت سے زیادہ یہاں آ گئی ہے۔ مَیں خیال کرتا ہوں کہ اگر وکٹر ہیوگو یہ منظر وہیں پر ختم کر دیتا جہاں بشپ نے شمع دان دے کر کہا تھا "سلامتی کے ساتھ جاؤ" تو یہ تصویر کہیں زیادہ موثر اور مکمل ہوتی۔ اس سے زیادہ بشپ کو خود اپنی زبان سے کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس سیرۃ (کیریکٹر) کی ساری تاثیر اُس کی حالت کی رفعت اور کیفیت میں ہے۔ صراحت اور وضاحت میں نہیں ہے--- بسا اوقات عمل کی تاثیر ایک مقدس خاموشی ہوتی ہے جسے چھونا نہیں چاہیے۔ زبان کی گویائی اُس میں مخل ہوسکتی ہے مگر اضافہ نہیں کر سکتی!

بہرحال جین یہاں سے نکلتا ہے، اور اب وہ وقت آتا ہے کہ زندگی بھر کی خواب گراں کے بعد اچانک اُس کی آنکھیں کھلتی ہیں اور وہ دیکھتا ہے کہ افکار و احساسات کی ایک بالکل نئی دُنیا اُس کے اندر پیدا ہوگئی ہے۔ یہ اُس کی زندگی میں پہلا موقع تھا کہ نفرت، حقارت اور سزا کی جگہ رحم، محبت اور عفو و بخشش کی دل نواز صدا اس کے کانوں میں پڑی تھی۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ اسے معلوم ہوا، اس دُنیا میں صرف "قانون" اور "سزا" ہی نہیں ہے بلکہ ان سے بھی ایک بالاتر حقیقت ہے جو "محبت" اور "قربانی" ہے اور جس کی وسعت اور گہرائیوں کی کوئی انتہا نہیں۔ وہ کتنا ہی اس حقیقت کی تاثیر سے بچنا چاہتا، لیکن یہ اس کا روح و دل زخمی کیے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ قید خانۂ تولون کا مشہور مجرم سہی، مگر پھر بھی انسان تھا۔ سانپ اور بھیڑیا نہ تھا۔ سانپ اور بھیڑیے کا پنجہ بھی تو محبت اور فیاضی کے سامنے نہیں اُٹھ سکتا؟ ناممکن تھا کہ وہ بشپ کی رحمت و قربانی سے اپنی شقاوت و معصیت کا مقابلہ نہ کرتا۔ اس کا دل جسے سوسائٹی کی بے مہری، قانون کی سنگ دلی، اور زندگی کی محرومیوں نے پتھر کی طرح سخت کر دیا تھا، اب محبت کی دل نوازیوں سے بے اختیار پگھلنے لگا۔ سچ مچ کو اس کی روح اس کی نہیں رہی تھی۔ اُسے بشپ کی نگاہِ محبت نے خرید لیا تھا۔ اس خرید و فروخت میں بشپ نے چند برتن کھوئے، لیکن جین نے اپنی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پوری زندگی جو گم ہو چکی تھی، واپس پالی۔ اگر بشپ جین کو قانون اور سزا کے حوالے کر دیتا تو کیا پاتا؟ چاندی کے چند برتن جو اس کے گھر سے چرائے گئے تھے۔ لیکن چاندی کے برتن زیادہ قیمتی ہیں یا خدا کے ایک بھٹکے ہوئے بندے کی خدا کی طرف واپسی؟ بشپ کا فیصلہ یہ تھا کہ چاندی نہیں بلکہ انسان قیمتی ہے! اُس نے برتنوں کے ساتھ شمع دان بھی ملا دیے۔ کیونکہ پھر بھی یہ سودا بہت ارزاں تھا۔

نیکی اور بدی میں کشمکش شروع ہوگئی۔ مقابلہ سخت تھا مگر جیت نیکی ہی کے لیے تھی۔ جین نے تاریکی اور گناہ کا دشت بے کنار پیچھے چھوڑا، اور ایک ہی جست میں نیکی اور خدا پرستی کی بلندیوں پر پہنچ گیا:

بال بکشا و صفیر از شجر طوبیٰ زن
حیف باشد چو تو مرغے کہ اسیر قفسی!

نیکی کی دُنیا بدی کی دُنیا سے کس قدر دُور معلوم ہوتی ہے اور پھر دیکھو تو کتنی نزدیک ہے؟ جب تک تم نے اس کی طرف قدم نہیں اُٹھایا، وہ اتنی دُور ہے کہ اُس کا نشانِ راہ بھی تمہیں دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن جونہی تم اس کی طرف چلے، وہ اتنی نزدیک ہو جاتی ہے کہ ساری مسافت ایک قدم سے زیادہ نہیں! یونانی علم الاصنام کی ضرب المثل تھی: ''مریخ کے مندر اور عطارد کے مندر میں صرف ایک دیوار حائل ہے۔'' کیونکہ دونوں ایک ہی احاطہ میں تھے، اور جہل و خونریزی کے مندر سے نکل کر علم و امن کے مندر میں جانے کے لیے صرف اِتنا کرنا پڑتا تھا کہ بیچ کے ایک دروازے سے نکل کر دوسرے دروازے میں قدم رکھ دیا۔ یہ اُس طرف اشارہ تھا کہ علم و جہل، محبت و جنگ اور نیکی و بدی کی دُنیائیں کتنی ہی وسیع اور دُور دراز نظر آتی ہوں، مگر اُس کے لیے جو ایک سے نکل کر دوسری میں قدم رکھنا چاہے؛ اس سے زیادہ مسافت نہیں ہے کہ ایک گھر کی چوکھٹ سے نکلے اور دوسری چوکھٹ میں قدم رکھ دیا!

طے می شود ایں رہ بہ درخشیدن برقے
ما بے خبراں منتظر شمع و چراغیم!

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بالآخر فرانس کا وہ مشہور مجرم جس کے لیے چوری پیشہ اور قتل تفریح تھی، جسے دُنیا کا قانون اور سوسائٹی کا انصاف اٹھارہ برس عذاب میں رکھ کر بھی جرم سے روک نہیں سکا تھا، جس کی شقاوت اور سیہ کاری اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ قید خانہ سے نکلتے ہی پہلا وار اپنے محسن پر کر گزرا، اور ذرا بھی ضمیر کی ملامت محسوس نہ کی؛ اب ایک شریف، راست باز، خدا پرست اور فیاض آدمی تھا جس کی دولت بندگانِ خدا کی بے لوث خدمت میں اور جس کی زندگی مصیبت زدوں اور بے سروسامانوں کی غم خواری میں صرف ہوتی تھی! اتنا ہی نہیں بلکہ گذشتہ کے احساس اور مستقبل کی طلب نے اب اس کے اندر نیکی اور ایثار کی ایک ایسی اعلیٰ روح پیدا کر دی تھی جس کی طاقت کی کوئی انتہا اور جس کی وسعت کا کوئی کنارہ نہ تھا۔ بشپ کا نمونہ اُسے اپنی روحانی بلندی کی سطح سے بھی ایک زیادہ بلندی کی طرف دعوت دے رہا تھا!

انسان کتنا ہی نیک بننا چاہے لیکن سوسائٹی اسے نیک بننے نہیں دیتی۔ وہ اس کا زندگی کے ہر گوشے اور ہر موڑ پر تعاقب کرتی ہے۔ جین کچھ سے کچھ ہوگیا، اس کی روح بدل گئی، اس کا دل پلٹ گیا، اس کا سینہ جو کبھی شیطان کا نشیمن تھا، مقدسوں کی نیکیوں کا آشیانہ اور فرشتوں کی پاکیوں کا خزینہ بن گیا؛ تاہم سوسائٹی نہ تو اسے معاف کر سکی، نہ اس کی راہ روکنے سے باز آئی۔ ایک کے بعد ایک آزمائشیں آتی گئیں، اور اس کی وہ نیکی جو بشپ نے شمع دان پکڑاتے ہوئے اس کے دل کے ریشے ریشے میں اُتار دی تھی، متزلزل نہ ہوئی۔ وہ قربانیوں پر قربانیاں کرتا گیا۔ اس نے انسان کی خدمت اور محبت کے لیے اپنا سب کچھ دے دیا۔ لیکن انسان اسے انصاف کا ایک کلمہ، اعتراف کا ایک اشارہ، عزت کی ایک غلط انداز نظر بھی نہ دے سکا!

افسانہ بہت طول کھینچتا ہے۔ سالہا سال گزر جاتے ہیں۔ یورپ کے بعض اہم واقعات شروع ہوتے ہیں اور ختم ہو جاتے ہیں۔ ''واٹرلو'' کا معرکہ اور ''فرانس کا تیسرا انقلاب'' بھی ہو چکتا ہے، لیکن جین کی عجیب و غریب زندگی کی مسلسل اور غیر مختتم قربانیاں ختم ہونے پر نہیں آتیں۔ وہ اپنی زندگی کا تمام آخری حصہ صرف کر کے جس یتیم اور مظلوم لڑکی کی پرورش کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس کی زندگی کی ساری نامرادیوں اور شقاوتوں کا صلہ اس بچہ کی محبت میں مل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جائے گا، وہ بھی اُس سے بے پروا ہو جاتی ہے۔ جس شخص کی زندگی کو وہ ایک ایسے زہرہ گداز اور دہشت انگیز خطرہ میں پڑ کر بچاتا ہے، جس کا تصور بھی انسان کو سہا دے، وہ بھی اس کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتا اور اس سے منہ موڑ لیتا ہے۔ آخر وہ وقت آتا ہے جب اسی برس کی عمر میں تنِ تنہا بسترِ موت پر کروٹیں بدلتا ہے۔ اس وقت انسان طیار (تیار) ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ انصاف کرے۔

ساری عمر کی نیکی اور قربانی کے بعد اعتراف کی یہی چند گھڑیاں تھیں جو سوسائٹی اُسے دے سکی!

وکٹر ہیوگو کی یہ تیار کی ہوئی سیرۃ (کیریکٹر) نہایت مقبول ہوئی ہے۔ یورپ کے بڑے بڑے مصوروں نے اس کا مرقع کھینچنے میں اپنے کمالات کے جوہر دکھلائے ہیں۔ سب سے بہتر مرقع مورس کا تسلیم کیا جاتا ہے جو گذشتہ صدی کا نامور فرانسیسی مصور تھا۔ اس مرقع میں اس نے وہ منظر دکھلایا ہے، جب پولیس کے سپاہی جین کو گرفتار کر کے لاتے ہیں اور بشپ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ جین دم بخود کھڑا ہے۔ اس کے ہاتھ میں چوری کے مال کا بقچہ ہے۔ بشپ مسکراتا ہوا آگے بڑھتا ہے اور چاندی کے شمع دان اسے پکڑا رہا ہے۔ نیچے یہ عبارت درج ہے: ''میرے دوست! تم رات جاتے ہوئے یہ شمع دان کیوں چھوڑ گئے؟ یہ بھی تو چاندی کے ہیں اور دو سو روپیہ میں فروخت ہو سکتے ہیں؟''

کچھ عرصہ ہوا مَیں سفر میں تھا اور گزرانِ وقت کے لیے یہ قصہ پڑھ رہا تھا۔ مَیں نے خیال کیا، وکٹر ہیوگو نے اپنے زورِ تخیل سے انسانی سیرۃ کا ایک بڑا ہی بلند اور دلآویز نقشہ کھینچا ہے، لیکن اگر اُس نے مشرق کی شاعری کی طرح (کیونکہ اُس نے سعدی اور حافظ کا مطالعہ کیا تھا) مشرق کے اخلاق و تصوف کا بھی مطالعہ کیا ہوتا تو اسے معلوم ہو جاتا کہ اس طرح کی اخلاقی سیرۃ یہاں کی عملی زندگی کے واقعات رہ چکے ہیں۔ پھر مجھے خیال آیا کہ سیّد الطائفہ جنید بغدادیؒ اور ابنِ ساباط کا واقعہ کس درجہ اس سے مشابہ اور اپنی تفصیلات میں کیسا شاندار اور موثر ہے؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۲)

ہجرۃ کی تیسری صدی قریب الاختتام ہے۔ بغداد کے تختِ خلافت پر المعتضد باللہ عباسی متمکن ہے۔ معتصم کے زمانے سے دارالخلافہ کا شاہی اور فوجی مستقر سامرہ میں منتقل ہو گیا ہے۔ پھر بھی سرزمین بابل کے اس نئے بابل میں پندرہ لاکھ انسان بستے ہیں۔ ایران کے اصطخر، مصر کے ریمسس اور یورپ کے روم کی جگہ اب دُنیا کا تمدنی مرکز بغداد ہے۔

دُنیا کی اس ترقی یافتہ مخلوق کا جسے ''انسان'' کہتے ہیں، کچھ عجیب حال ہے۔ یہ جتنا کم ہوتا ہے، اُتنا ہی نیک اور خوش ہوتا ہے۔ اور جتنا زیادہ بڑھتا ہے، اُتنی ہی نیکی اور خوشی اس سے دُور ہونے لگتی ہے۔ اُس کا کم ہونا خود اس کے لیے اور خدا کی زمین کے لیے برکت ہے۔ یہ جب چھوٹی چھوٹی بستیوں میں گھانس پھونس کے چھپر ڈال کر رہتا ہے، تو کیسا نیک، کیسا خوش اور کس درجہ حلیم ہوتا ہے؟ محبت اور رحمت اُس میں اپنا آشیانہ بناتی ہے اور روح کی پاکیزگی کا نور اس کے جھونپڑوں کو روشن کرتا ہے۔ لیکن جونہی یہ جھونپڑیوں سے باہر نکلتا ہے، اُس کی بڑی بڑی بھیڑیں ایک خاص رقبہ میں اکٹھی ہو جاتی ہیں، تو اُس کی حالت میں کیسا عجیب انقلاب ہو جاتا ہے؟ ایک طرف تجارت بازاروں میں آتی ہے، صنعت وحرفت کارخانے کھولتی ہے، دولت سربفلک عمارتیں بناتی ہے، حکومت و امارت شان وشکوہ کے سامان آراستہ کرتی ہے۔ لیکن دوسری طرف نیکی رخصت ہو جاتی ہے، محبت اور فیاضی کا سراغ نہیں ملتا، اور امن و راحت کی جگہ انسانی مصیبتوں اور شقاوتوں کا ایک لازوال دور شروع ہو جاتا ہے۔ وہی انسان کی بستی جو پہلے نیکی ومحبت کی دُنیا اور راحت و برکت کی بہشت تھی، اب افلاس ومصیبت کا مقتل اور جرموں اور بدیوں کی دوزخ بن جاتی ہے۔ وہی انسان جو جھونپڑیوں کے اندر محبت و فیاضی کی گرمجوشی تھا، اب شہر کے سربفلک محلوں کے اندر بے مہری وخود غرضی کا پتھر ہوتا ہے۔ جب وہ اپنے عالیشان مکانوں میں عیش ونعمت کے دسترخوانوں پر بیٹھتا ہے، تو اس کے کتنے ہی ہم جنس سڑکوں پر بھوک سے ایڑیاں رگڑتے ہیں! جب وہ عیش و راحت کے ایوانوں میں حسن و جمال کی محفلیں آراستہ کرتا ہے، تو اس کے ہمسایہ میں یتیموں کے آنسو نہیں تھمتے اور کتنی ہی بیوائیں ہوتی ہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جن کے بدنصیب سروں پر چادر کا ایک تار بھی نہیں ہوتا! زندگی کی قدرتی یکسانی کی جگہ اَب زندگی کی مصنوعی مگر بے رحم تفاوتیں ہر گوشے میں نمایاں ہو جاتی ہیں!

پھر جب انسانی بے مہری اور خود غرضی کے لازمی نتائج ظاہر ہونے لگتے ہیں، کمزوری، افلاس، اور بے نوائی سے مجبور ہو کر بدبخت انسان جرم کی طرف قدم اُٹھاتا ہے تو اچانک دُنیا کی زبانوں کا سب سے زیادہ بے معنی لفظ وجود میں آ جاتا ہے۔ یہ ''قانون'' اور ''انصاف'' ہے۔ اَب بڑی بڑی شاندار عمارتیں تعمیر کی جاتی ہیں اور اُن کے دروازہ پر لکھا جاتا ہے ''انصاف کا گھر''۔ انصاف کے اس ''مقدس گھر'' میں کیا ہوتا ہے؟ یہ ہوتا ہے کہ وہی انسان جس نے اپنی بے رحمی و تغافل سے مفلس کو چوری پر اور نیک انسانوں کو بداطوار سے بن جانے پر مجبور کر دیا تھا، قانون کا پُر ہیبت جُبّہ پہن کر آتا ہے، اور فرشتوں کا سا معصوم اور راہبوں کا سا سنجیدہ چہرہ بنا کر حکم دیتا ہے کہ مجرم کو سزا دی جائے۔

کیوں؟

اِس لیے کہ اُس نے چوری کی ہے۔

اُس بدبخت نے چوری کیوں کی؟

اس لیے کہ وہ انسان ہے، اور انسان بھوک کا عذاب برداشت نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ وہ شوہر ہے، اور شوہر اپنی بیوی کو بھوک سے ایڑیاں رگڑتے دیکھ نہیں سکتا۔ اس لیے کہ وہ باپ ہے، اور باپ کی طاقت سے باہر ہے کہ اپنے بچوں کے اُن آنسوؤں کا نظارہ کر سکے جو بھوک کی اذیت سے اُن کے معصوم چہروں پر بہہ رہے ہوں!

پھر اگر بدقسمت انسان قید خانہ اور تازیانے کی سزائیں جھیل کر بھی اِس قابل نہیں ہو جاتا کہ بغیر غذا کے زندہ رہ سکے، تو ''مقدس انصاف'' اصلاح اور انسانیت کا آخری قدم اُٹھاتا ہے، اور کہتا ہے اسے سولی کے تختے پر لٹکا دو! یہ گویا انسان کے پاس اُس کے ابناء جنس کی مصیبتوں اور شقاوتوں کا آخری علاج ہے!

یہ ہے انسان کی شہری اور متمدن زندگی کا اخلاق! وہ خود ہی انسان کو برائی پر مجبور کرتا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے اور خود ہی سزا بھی دیتا ہے۔ پھر ظلم اور بے رحمی کے اس تسلسل کو ''انصاف'' کے نام سے تعبیر کرتا ہے۔ اُس ''انصاف'' کے نام سے، جو دُنیا کی سب سے زیادہ مشہور مگر سب سے زیادہ غیر موجود حقیقت ہے!

چوتھی صدی ہجری کا بغداد دُنیا کا سب سے بڑا شہر اور انسانی تمدن کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ اس لیے ضروری تھا کہ انسانی آبادی و تمدن کے یہ تمام لازمی نتائج موجود ہوتے۔ گندگی میں مکھیاں اور دلدل میں مچھر اس تیزی سے پیدا نہیں ہوتے، جس تیزی سے شہروں کی آب و ہوا جرم اور مجرموں کو پیدا کرتی ہے۔ بغداد کے قید خانے مجرموں سے بھرے ہوئے تھے۔ پھر بھی اس کی آبادیوں میں مجرموں کی کوئی کمی نہ تھی!

بغداد میں آج کل جس طرح حضرت شیخ جنید بغدادیؒ کی بزرگی و درویشی کی شہرت ہے، اُسی طرح ابنِ ساباط کی چوری اور عیاری بھی مشہور ہے۔ پہلی شہرت نیکی کی ہے، دوسری بدی کی۔ دُنیا میں بدی، نیکی کی ہر چیز کی طرح، اُس کی شہرت کا بھی مقابلہ کرنا چاہتی ہے، اگرچہ نہیں کر سکتی۔

دس برس سے ابنِ ساباط مدائن کے محبس میں قید ہے۔ اُس کے خوفناک حملوں سے لوگ محفوظ ہو گئے ہیں۔ تاہم اُس کی عیاریوں اور بے باکیوں کے افسانے لوگ بھولے نہیں۔ وہ جب کبھی کسی دلیرانہ چوری کا حال سنتے ہیں تو کہنے لگتے ہیں ''یہ دوسرا ابنِ ساباط ہے۔'' اس دس برس کے اندر کتنے ہی نئے ابنِ ساباط پیدا ہو گئے مگر پرانے ابنِ ساباط کی شہرت کا کوئی مقابلہ نہ کر سکا۔ بغداد والوں کی بول چال میں وہ ''جرائم کا شیطان اور برائیوں کا عفریت'' تھا!

ابنِ ساباط کے خاندانی حالات عوام کو بہت کم معلوم ہیں۔ جب وہ پہلی مرتبہ سوق النجارین میں چوری کرتا ہوا گرفتار ہوا تو کوتوالی میں اس کے حالات کی تفتیش کی گئی۔ معلوم ہوا یہ بغداد کا باشندہ نہیں ہے۔ اس کے ماں باپ طوس سے ایک قافلہ کے ساتھ آ رہے تھے، راہ میں بیمار پڑے اور مر گئے۔ قافلہ والوں کو رحم آیا اور اپنے ساتھ بغداد پہنچا دیا۔ یہ اَب سے دو برس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پیشتر کی بات ہے۔ یہ دو برس اس نے کہاں اور کیوں کر بسر کیے؟ اس کا حال کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ گرفتاری کے وقت اُس کی عمر پندرہ سولہ برس کی تھی۔ کوتوالی کے چبوترے پر لٹا کر تازیانے مارے گئے اور چھوڑ دیا گیا۔

اس پہلی سزا نے اس کی طبیعت پر کچھ عجیب طرح کا اثر ڈالا۔ وہ اب تک ایک ڈرا سہما کم سن لڑکا تھا۔ اب اچانک ایک دلیر اور بے باک مجرم کی روح اس کے اندر پیدا ہوگئی۔ گویا اس کی تمام شقاوتیں اپنے ظہور کے لیے تازیانے کی ضرب کی منتظر تھیں۔ مجرمانہ اعمال کے تمام بھید اور بدیوں گناہوں کے تمام مخفی طریقے جو کبھی اُس کے وہم وگمان میں بھی نہیں گزرے تھے، اب اس طرح اُس پر کھل گئے، گویا ایک تجربہ کار اور مشتاق مجرم کا دماغ اس کے سر میں اُتار دیا گیا۔ تھوڑے ہی دنوں کے اندر وہ ایک پکا عیار اور ایک چھٹا ہوا جرائم پیشہ انسان تھا۔

اب وہ چھوٹی چھوٹی چوریاں نہیں کرتا تھا۔ پہلی مرتبہ جب اُس نے چوری کی تھی، تو دو دن کی بھوک اُسے نان بائی کی دکان پر لے گئی تھی۔ لیکن اب وہ بھوک سے بے بس ہو کر نہیں بلکہ جرم کے ذوق سے وارفتہ ہو کر چوری کرتا تھا۔ اس لیے اُس کی نگاہیں نان بائی کی روٹیوں پر نہیں بلکہ صرافوں کی تھیلیوں اور سوداگروں کے ذخیروں پر پڑتی تھیں۔ دن ہو یا رات، بازار کی منڈی ہو یا امیر کا دیوان خانہ، ہر وقت اور ہر جگہ اُس کی کارستانیاں جاری رہتیں۔ اُس کے اندر ایک فاتح کا جوش تھا، سپہ سالار کا سا عزم تھا، سپاہی کی مردانگی تھی، مدبر کی سی دانشمندی تھی؛ لیکن دُنیا نے اُس کے لیے یہی پسند کیا کہ وہ بغداد کے بازاروں کا چور ہو۔ اس لیے اُس کی فطرت کے تمام جوہر اسی راہ میں نمایاں ہونے لگے۔ افسوس، فطرت کس فیاضی سے بخشتی ہے، مگر انسان کس بے دردی سے برباد کرتا ہے۔

کچھ دنوں کے بعد جب ابنِ ساباط کی دراز دستیاں حد سے بڑھ گئیں تو حکومت کو خصوصیت کے ساتھ توجہ ہوئی۔ آخر ایک دن گرفتار کر لیا گیا۔ اب یہ ایک کم سن لڑکا نہ تھا، شہر کا سب سے بڑا چور تھا۔ عدالت نے فیصلہ کیا کہ ایک ہاتھ کاٹ ڈالا جائے۔ فوراً تعمیل ہوئی، اور جلاد نے ایک ہی ضرب میں اس کا پہنچا الگ کر دیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ابن ساباط کے ہاتھ کا کٹنا، کٹنا نہ تھا، بلکہ سینکڑوں نئے ہاتھوں کو اُس کے شانے سے جوڑ دینا تھا۔ معلوم ہوتا ہے، دُنیا کے سارے شیطان اور عفریت اس واقعہ کے انتظار میں تھے۔ جونہی اُس کا ہاتھ کٹا، اُنھوں نے اپنے سیکڑوں ہاتھ اُس کے حوالے کر دیئے۔ اب اُس نے عراق کے تمام چور اور عیار جمع کر کے اپنا اچھا خاصہ جتھا بنا لیا اور فوجی ساز و سامان کے ساتھ لوٹ مار شروع کر دی۔ تھوڑے ہی عرصہ کے اندر اُس کے دلیرانہ حملوں نے تمام عراق میں تہلکہ مچا دیا۔ وہ قافلوں پر حملے کرتا، دیہاتوں میں ڈاکے ڈالتا، محل سراؤں میں نقب لگاتا؛ سرکاری خزانے لوٹ لیتا؛ اور پھر یہ سب کچھ اس ہوشیاری اور فرزانگی کے ساتھ کرتا کہ اُس پر یا اُس کے ساتھیوں پر کوئی آنچ نہ آتی۔ ہر موقعہ پر صاف بچ کر نکل جاتا۔ لوگ جب اُس کے مجرمانہ کارنامے سنتے تو دہشت و حیرت سے مبہوت رہ جاتے۔ ''یہ ڈاکو نہیں ہے جرم کی ایک خبیث روح ہے۔ وہ انسان کو لوٹ لیتی ہے مگر انسان اُسے چھو نہیں سکتا۔'' یہ بغداد والوں کا متفقہ فیصلہ تھا۔

مگر ظاہر ہے، یہ حالت کب تک جاری رہ سکتی تھی؟ آخر وہ وقت آ گیا کہ ابن ساباط تیسری مرتبہ قانون کے پنجے میں گرفتار ہو جائے۔ ایک موقعہ پر جب اُس نے اپنے تمام ساتھیوں کو بحفاظت نکال دیا تھا اور خود نکل بھاگنے کی تیاری کر رہا تھا، حکومت کے سپاہی پہنچ گئے اور گرفتار کر لیا۔

اس مرتبہ وہ ایک رہزن اور ڈاکو کی حیثیت میں گرفتار ہوا تھا، اس کی سزا قتل تھی۔ ابنِ ساباط نے جب دیکھا کہ جلاد کی تلوار سر پر چمک رہی ہے تو اس کے مجرمانہ خصائل نے اچانک ایک دوسرا رنگ اختیار کر لیا۔ وہ تیار ہو گیا کہ اپنے بچاؤ کے لیے اپنے ساتھیوں کی جانیں قربان کر دے۔ اُس نے عدالت سے کہا اگر اُسے قتل کی سزا نہ دی جائے تو وہ اپنے جتھے کے تمام چور گرفتار کرا دے گا۔ عدالت نے منظور کر لیا۔ اس طرح ابنِ ساباط خود تو قتل سے بچ گیا، لیکن اس کے سو سے زیادہ ساتھی اُس کی نشان دہی پر موت کے گھاٹ اُتار دیئے گئے۔ ان سو چوروں میں ایک بھی ایسا نہ تھا جس نے قتل ہونے سے پہلے ابنِ ساباط کے نام پر لعنت نہ بھیجی ہو۔ بدعہدی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور بے وفائی ایسی برائی ہے جسے برے بھی سب سے بڑی برائی ثابت سمجھتے ہیں۔ ابنِ ساباط نے اپنے اس طرزِ عمل سے ثابت کر دیا کہ وہ جرم سے بھی بڑھ کر برائی کا کوئی ایک درجہ رکھتا تھا۔

بہرحال اب ابنِ ساباط مدائن کے قیدخانہ میں زندگی کے دن پورے کر رہا ہے۔ اُس کی آخری گرفتاری پر دس برس گزر چکے ہیں۔ دس برس کا زمانہ اس کے لیے کم مدت نہیں ہے کہ ایک مجرم کی سیاہ کاریاں بھلا دی جائیں، لیکن ابنِ ساباط جیسے مجرم کے کارنامے مدتوں تک نہیں بھلائے جاسکتے۔ دس برس گزرنے پر بھی اُس کے دلیرانہ جرائم کا ذکر بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔ لوگوں کو یہ بات تو کبھی بھولے سے بھی یاد نہیں آتی کہ ابنِ ساباط ہے کہاں اور اور کس حالت میں؟ کیونکہ یہ معلوم کرنے کی اُنھیں ضرورت بھی نہیں ہے۔ البتہ وہ اُس کے دلیرانہ کارنامے بھولنا نہیں چاہتے، کیونکہ اس تذکرہ میں اُن کے لیے لطف اور دلچسپی ہے۔ اُنہیں ابنِ ساباط کی نہیں، اپنی دلچسپیوں کی فکر ہے۔

انسان کی بے مہریوں کی طرح اُس کی دلچسپیوں کا بھی کیسا عجیب حال ہے؟ وہ عجیب عجیب اور غیر معمولی باتیں دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ لیکن اس کی پرواہ نہیں کرتا کہ اس کی دلچسپی کا یہ تماشا کیسی کیسی مصیبتوں اور شقاوتوں کی پیدائش کے بعد ظہور میں آ سکا ہے؟ اگر ایک چور دلیری کے ساتھ چوری کرتا ہے تو یہ اُس کے لیے بڑی ہی دلچسپی کا واقعہ ہے۔ وہ اُس کی صورت دیکھنے کے لیے بے قرار ہو جاتا ہے۔ وہ گھنٹوں اس پر رائے زنی کرتا ہے اور وہ تمام اخبار خرید لیتا ہے جن میں اُس کی تصویر چھپی ہو یا اُس کا تذکرہ کیا گیا ہو۔ لیکن اس واقعہ میں چور کے لیے کیسی شقاوت ہے؟ اور جس مسکین کا مال چوری کیا گیا ہے اُس کے لیے کیسی مصیبت ہے؟ اس کے سوچنے کی وہ کبھی زحمت گوارا نہیں کرتا۔

اگر ایک مکان میں آگ لگ جائے تو انسان کے لیے یہ بڑا ہی دلچسپ نظارہ ہوتا ہے۔ سارا شہر اُمنڈ آتا ہے، جس کسی کو دیکھو بے تحاشا دوڑا جاتا ہے، لوگ اس نظارہ کے شوق میں اپنا کھانا پینا تک بھول جاتے ہیں۔ اگر چند زندہ انسانوں کے جھلسے ہوئے چہرے آگ کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شعلوں کے اندر نمودار ہو جائیں اور اُن کی چیخیں اتنی بلند ہوں کہ دیکھنے والوں کے کانوں تک پہنچ سکیں، تو پھر اس نظارہ کی دلچسپی انتہائی حد تک پہنچ جاتی ہے، تماشائی جوشِ نظارہ میں مجنوں ہو کر ایک دوسرے پر گرنے لگتے ہیں۔ لیکن انسانی دلچسپی کے اس جہنمی منظر میں اُس مکان اور اس کے مکینوں کے لیے کیسی ہلاکت اور تباہی ہے؟ اور جان و مال کی کیسی المناک بربادیوں کے بعد آگ اور موت کی یہ ہولناک دلچسپی وجود میں آسکی ہے؟ اس بات کے سوچنے کی نہ تو لوگوں کو فرصت ملتی ہے، نہ وہ سوچنا چاہتے ہیں۔

اگر انسان کے ابناءِ جنس میں سے ایک بدبخت مخلوق سولی کے تختہ پر لٹکا دیا جائے، تو یہ اُن تمام نظاروں میں سے جن کے دیکھنے کا انسان شائق ہوسکتا ہے، سب سے زیادہ دلکش نظارہ ہوتا ہے۔ اتنا دلکش نظارہ ہوتا ہے۔ اتنا دلکش نظارہ کہ گھنٹوں کھڑے رہ کر لٹکتی ہوئی نعش دیکھتا رہتا ہے مگر اُس کی سیری نہیں ہوتی۔ لوگ درختوں پر چڑھ جاتے ہیں، ایک دوسرے پر گرنے لگتے ہیں، صفیں چیر چیر کر نکل جانا چاہتے ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ اپنے ایک ہم جنس کو جان کنی میں تڑپتے اور پھر ہوا میں معلق جھولتے دیکھ لینے کی لذت حاصل کر لیں۔ لیکن جس انسان کے پھانسی پانے سے انسانی نظارہ کا یہ سب سے زیادہ دلکش تماشا وجود میں آیا، خود اس پر کیا گزری؟ اور کیوں وہ اس منحوس اور شرمناک موت کا مستحق ٹھہرا؟ سیکڑوں ہزاروں تماشائیوں میں سے ایک کا ذہن بھی اس غیر ضروری اور غیر دلچسپ پہلو کی طرف نہیں جاتا۔

(۳)

گرمیوں کا موسم ہے۔ آدھی رات گزر چکی ہے۔ مہینہ کی آخری راتیں ہیں۔ بغداد کے آسمان پر ستاروں کی مجلسِ شبینہ آراستہ ہے، مگر چاند کے برآمد ہونے میں ابھی دیر ہے۔ دجلہ کے پار کرخ کی تمام آبادی نیند کی خاموشی اور رات کی تاریکی میں گم ہے۔

اچانک تاریکی میں ایک متحرک تاریکی نمایاں ہوئی۔ سیاہ لبادے میں ایک لپٹا ہوا آدمی خاموشی اور آہستگی کے ساتھ جا رہا ہے۔ وہ ایک گلی سے مڑ کر دوسری گلی میں پہنچا، اور ایک مکان کے سائبان کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ اب اُس نے سانس لی۔ گویا یہ مدت کی بند سانس تھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جسے اب آزادی سے اُبھرنے کی مہلت ملی ہے۔ پھر اُس نے آسمان کی طرف نظر اُٹھائی ''یقیناً تین پہر رات بیت چکی ہے۔'' وہ اپنے دل میں کہنے لگا۔ ''مگر کیا بدنصیبی ہے کہ جس طرف رُخ کیا، ناکامی ہی ہوئی۔ کیا پوری رات اسی طرح ختم ہو جائے گی؟''

یہ خوفناک ابنِ ساباط ہے جو دس برس کی طول طویل زندگی قیدخانہ میں بسر کر کے اب کسی طرح نکل بھاگا ہے، اور نکلنے کے ساتھ ہی اپنا قدیم پیشہ ازسرِ نو شروع کر رہا ہے۔ یہ اس کی نئی مجرمانہ زندگی کی پہلی رات ہے، اس لیے وقت کے بے نتیجہ ضائع جانے پر اُس کا بے صبر دل پیچ و تاب کھا رہا ہے۔

اُس نے ہر طرف کی آہٹ لی۔ زمین سے کان لگا کر دُور دُور کی صداؤں کا جائزہ لیا، اور مطمئن ہو کر آگے بڑھا۔ کچھ دُور چل کر اس نے دیکھا ایک احاطہ کی دیوار دور تک چلی گئی ہے اور وسط میں بہت بڑا پھاٹک ہے۔ کرخ کے اس علاقہ میں زیادہ تر اُمراء کے باغ تھے، یا سوداگروں کے گودام تھے۔ اس نے خیال کیا، یہ احاطہ یا تو کسی امیر کا باغ ہے، یا کسی سوداگر کا گودام۔ وہ پھاٹک کے پاس پہنچ کر رُک گیا اور سوچنے لگا، اندر کیوں کر جائے؟ اُس نے آہستگی سے دروازہ پر ہاتھ رکھا، لیکن اُسے نہایت تعجب ہوا کہ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا صرف بھڑا ہوا تھا۔ ایک سیکنڈ کے اندر ابنِ سباط کے قدم احاطہ کے اندر پہنچ گئے۔

اُس نے دہلیز سے قدم آگے بڑھایا تو ایک وسیع احاطہ نظر آیا۔ اس کے مختلف گوشوں میں چھوٹے چھوٹے حجرے بنے تھے، اور وسط میں ایک نسبتاً بڑی عمارت تھی۔ یہ درمیانی عمارت کی طرف بڑھا۔ عجیب بات ہے کہ اس کا دروازہ بھی اندر سے بند نہ تھا، چھوتے ہی کھل گیا۔ گویا وہ کسی کی آمد کا منتظر تھا۔ یہ ایک ایسی بے باکی کے ساتھ جو صرف مشاق مجرموں ہی کے قدموں میں ہو سکتی ہے، اندر چلا گیا۔ اندر جا کر دیکھا تو ایک وسیع ایوان (ہال) تھا۔ لیکن سامانِ راحت و زینت میں سے کوئی چیز بھی نہ تھی۔ قیمتی اشیا کا نام و نشان نہ تھا۔ صرف ایک کھجور کے پتوں کی پرانی چٹائی بچھی تھی، اور ایک طرف چمڑے کا ایک تکیہ پڑا تھا۔ البتہ ایک گوشہ میں پشمینہ کے موٹے کپڑے کے بہت سے تھان اس طرح بے ترتیب پڑے تھے گویا کسی نے جلدی میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پھینک دیے ہیں اور اُن کے قریب ہی بھیڑ کی کھال کی چند ٹوپیاں بھی پڑی تھیں۔ اس نے مکان کی موجودات کا یہ پورا جائزہ کچھ تو اپنی اندھیرے میں دیکھ لینے والی آنکھوں سے لے لیا تھا اور کچھ اپنے ہاتھ سے ٹٹول ٹٹول کر۔ لیکن اس کا ہاتھ ایک ہی تھا۔ یہ بغداد والوں کی بول چال میں ''ایک ہاتھ کا شیطان'' تھا جو اب پھر قید و بند کی زنجیریں توڑ کر آزاد ہو گیا ہے۔

دس برس کی قید کے بعد آج ابنِ ساباط کو پہلی مرتبہ موقع ملا تھا کہ اپنے دل پسند کام کی جستجو میں آزادی کے ساتھ نکلے۔ جب اُس نے دیکھا، اس مکان میں کامیابی کے آثار نظر نہیں آتے، اور یہ پہلا قدم بیکار ثابت ہوگا، تو اس کے تیز اور بے لگام جذبات سخت مشتعل ہو گئے۔ وہ دل ہی دل میں اس مکان کے رہنے والوں کو گالیاں دینے لگا، جو اپنے مکان میں رکھنے کے لیے قیمتی اشیاء فراہم نہ کر سکے۔ ایک مفلس کا افلاس خود اس کے لیے اس قدر دردانگیز نہیں ہوتا جس قدر اس چور کے لیے جو رات کے پچھلے پہر مال و دولت تلاش کرتا ہوا پہنچتا ہے۔ اس میں شک نہیں، پشمینہ کے بہت سے تھان یہاں موجود تھے اور وہ کتنے ہی موٹے اور ادنیٰ قسم کے کیوں نہ ہوں مگر پھر بھی اپنی قیمت رکھتے تھے، لیکن مشکل یہ تھی کہ ابنِ ساباط تنہا تھا۔ اور صرف تنہا ہی نہیں تھا، بلکہ دو ہاتھوں کی جگہ صرف ایک ہاتھ رکھتا تھا۔ وہ ہزار ہمت کرتا، مگر اتنا بڑا بوجھ اس کے سنبھالے سنبھل نہیں سکتا تھا۔ وہ تھانوں کی موجودگی پر معترض نہ تھا۔ اُن کے وزن کی گرانی اور اپنی مجبوری پر متاسف تھا۔ اتنی وزنی چیز چرا کر لے جانا آسان نہ تھا۔

''ایک ہزار لعنت کرخ اور اس کے تمام باشندوں پر'' وہ اندر ہی اندر بڑبڑانے لگا ''نہیں معلوم یہ کون احمق ہے جس نے یہ ملعون تھان جمع کر رکھے ہیں؟ غالباً کوئی تاجر ہے۔ لیکن یہ عجیب طرح کا تاجر ہے جسے بغداد میں تجارت کرنے کے لیے اور کوئی چیز نہیں ملی۔ اتنا بڑا مکان بنا کر اس میں گدھوں اور خچروں کی جھول بنانے کا سامان جمع کر دیا۔'' اس نے اپنے ایک ہی ہاتھ سے ایک تھان کی ٹٹول ٹٹول کر پیمائش کی۔ ''بھلا یہ ملعون بوجھ کس طرح اُٹھایا جا سکتا ہے؟ ایک تھان کے اُٹھانے کے لیے گن کر دس گدھے لانے چاہئیں۔''

لیکن بہرحال کچھ نہ کچھ کرنا ضروری تھا۔ رات جا رہی تھی، اور اَب وقت نہ تھا کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوسری جگہ تا کی جاتی۔ اُس نے جلدی سے ایک تھان کھولا اور اُسے فرش پر بچھا دیا۔ پھر کوشش کی زیادہ سے زیادہ تھان جو اُٹھائے جا سکتے ہیں اُٹھا لے۔ مشکل یہ تھی کہ مال کم قیمت مگر بہت زیادہ وزنی تھا۔ کم لیتا ہے تو بیکار ہے۔ زیادہ لیتا ہے تو لے جا نہیں سکتا۔ عجب طرح کی کش مکش میں گرفتار تھا۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح یہ مرحلہ طے ہوا، لیکن اب دوسری مشکل پیش آئی۔ صوف کا کپڑا بیحد موٹا تھا۔ اُسے مروڑ دے گرہ لگانا آسان نہ تھا۔ دونوں ہاتھوں سے بھی یہ کام مشکل تھا، چہ جائے کہ ایک ہاتھ سے؟ بلاشبہ اس کے پاس ہاتھ کی طرح پاؤں ایک نہ تھا، دو تھے۔ لیکن وہ بھاگنے میں مدد دے سکتے تھے۔ صوف کی گٹھری باندھنے کے لیے سودمند نہ تھے۔ اُس نے بہت سی تجویزیں سوچیں، طرح طرح کے تجربے کیے۔ دانتوں سے کام لیا، کٹی ہوئی کہنی سے سرا دبایا۔ لیکن کسی طرح بھی گٹھری میں گرہ نہ لگ سکی۔ وقت کی مصیبتوں میں تاریکی کی شدت نے اور زیادہ اضافہ کر دیا تھا۔

اندرونی جذبات کے ہیجان اور بیرونی فعل کی بے سود محنت نے ابنِ ساباط کو بہت جلد تھکا دیا۔ وقت کی کمی، عمل کا قدرتی خوف، مال کی گرانی، محنت کی شدت، اور فائدہ کی قلت، اس کے دماغ کے لیے تمام مخالف تاثرات جمع ہو گئے تھے۔

اچانک وہ چونک اُٹھا۔ اُس کی تیز قوتِ سماعت نے کسی کے قدموں کی نرم آہٹ محسوس کی۔ ایک لمحہ تک خاموشی رہی۔ پھر ایسا محسوس ہوا، جیسے کوئی آدمی دروازہ کے پاس کھڑا ہے۔ ابنِ ساباط گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ مگر قبل اس کے کہ وہ کوئی حرکت کر سکے، دروازہ کھلا اور روشنی نمایاں ہوئی۔ خوف اور دہشت سے اُس کا خون منجمد ہو گیا۔ جہاں کھڑا تھا، وہیں قدم گڑ گئے۔ نظر اُٹھا کر دیکھا تو سامنے ایک شخص کھڑا ہے۔ اس کے ایک ہاتھ میں شمع دان ہے اور اُسے اس طرح اونچا کر رکھا ہے کہ کمرے کے تمام حصے روشن ہو گئے ہیں۔

اس شخص کی وضع قطع سے اُس کی شخصیت کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ ملگجے رنگ کی ایک لمبی عبا اُس کے جسم پر تھی، جسے کمر کے پاس ایک موٹی رسی لپیٹ کر جسم پر چست کر لیا تھا۔ سر پر سیاہ قلنسوہ (اونچی دیوار کی ٹوپی) تھی، اور اس قدر کشادہ تھی کہ اُس کے کنارے ابروؤں کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قریب تک پہنچ گئے تھے۔ جسم نہایت نحیف تھا۔ اتنا نحیف کہ صوف کی موٹی عبا پہننے پر بھی اندر کی اُبھری ہوئی ہڈیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں، اور قد کی درازی نے جس میں کمر کے پاس خفیف سی خمیدگی پیدا ہوگئی تھی، یہ نحافت اور زیادہ نمایاں کردی تھی۔ لیکن یہ عجیب بات تھی کہ جسم کی اس غیر معمولی نحافت کا کوئی اثر اُس کے چہرہ پر نظر نہیں آتا تھا۔ اتنا کمزور جسم رکھنے پر بھی اُس کا چہرہ کچھ عجیب طرح کی تاثیر و گیرائی رکھتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہڈیوں کے ایک ڈھانچے پر ایک شاندار اور دلآویز چہرہ جوڑ دیا گیا ہے۔ رنگت زرد تھی، رخسار بے گوشت تھے، جسمانی تنومندی کا نام و نشان نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی چہرہ کی مجموعی ہیئت میں کوئی ایسی شاندار چیز تھی کہ دیکھنے والا محسوس کرتا تھا، ایک نہایت طاقتور چہرہ اُس کے سامنے ہے۔ خصوصاً اُس کی نگاہیں ایسی روشن، ایسی مطمئن، ایسی ساکن تھیں کہ معلوم ہوتا تھا، دُنیا کی ساری راحت اور سکون انھی دو حلقوں کے اندر سما گئی ہے۔

چند لمحوں تک یہ شخص شمع اونچی کیے ابنِ ساباط کو دیکھتا رہا، پھر اس طرح آگے بڑھا، گویا اُسے جو کچھ سمجھنا تھا، سمجھ چکا ہے۔ اس کے چہرہ پر ہلکا سا زیرِ لب تبسم تھا۔ ایسا دلآویز اور شیریں تبسم، جس کی موجودگی انسانی روح کے سارے اضطراب اور خوف دور کر دے سکتی ہے۔ اُس نے شمع دان ایک طرف رکھ دیا، اور ایک ایسی آواز میں جو شفقت و ہمدردی میں ڈوبی ہوئی تھی، ابنِ ساباط سے کہا:

''میرے دوست! تم پر خدا کی سلامتی ہو۔ جو کام تم کرنا چاہتے ہو، یہ بغیر روشنی اور ایک رفیق کے انجام نہیں پا سکتا۔ دیکھو، یہ شمع روشن ہے اور میں تمہاری رفاقت کے لیے موجود ہوں۔ روشنی میں ہم دونوں اطمینان اور سہولت کے ساتھ یہ کام انجام دے لیں گے۔''

وہ ایک لمحہ کے لیے رُکا، جیسے کچھ سوچنے لگا ہے، پھر اُس نے کہا: ''مگر میں دیکھتا ہوں تم بہت تھک گئے ہو۔ تمہاری پیشانی پسینہ سے تر ہو رہی ہے۔ یہ گرم موسم، بند کمرہ، تاریکی اور تاریکی میں ایسی سخت محنت؛ افسوس، انسان کو اپنے رزق کے لیے کیسی کیسی زحمتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ دیکھو، یہ چٹائی بچھی ہے۔ یہ چمڑے کا تکیہ ہے، میں اسے دیوار کے ساتھ لگا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دیتا ہوں۔'' اُس نے تکیہ دیوار کے ساتھ لگا کر رکھ دیا ''بس ٹھیک ہے، اب تم اطمینان کے ساتھ ٹیک لگا کر یہاں بیٹھ جاؤ اور اچھی طرح سستا لو۔ اتنی دیر میں مَیں تمہارا ادھورا کام پورا کیے دیتا ہوں۔''

اُس نے یہ کہا اور ابنِ ساباط کے کاندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھ کر اُسے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ پھر جب اُس کی نظر دوبارہ اُس کی عرق آلود پیشانی پر پڑی، تو اُس نے اپنی کمر سے رومال کھولا اور اس کی پیشانی کا پسینہ پونچھ ڈالا۔ جب وہ پسینہ پونچھ رہا تھا تو اس کی آنکھوں میں باپ کی سی شفقت اور ہاتھوں میں بھائی کی سی محبت کام کر رہی تھی۔

صورتِ حال کے یہ تمام تغیرات اس تیزی سے ظہور میں آئے کہ ابنِ ساباط کا دماغ مختل ہو کر رہ گیا۔ وہ کچھ سمجھ نہ سکا کہ معاملہ کیا ہے؟ ایک مدہوش اور بے ارادہ آدمی کی طرح اس نے اجنبی کے اشارہ کی تعمیل کی اور چٹائی پر بیٹھ گیا۔

اب اُس نے دیکھا کہ واقعی اجنبی نے کام شروع کر دیا ہے۔ اُس نے پہلے وہ گٹھری کھولی جو ابن ساباط نے باندھنی چاہی تھی مگر نہیں بندھ سکی تھی۔ پھر دو تھان کھول کر بچھا دیے اور جس قدر بھی تھان موجود تھے، اُن سب کو دو حصوں میں منقسم کر دیا۔ ایک حصہ میں زیادہ تھے۔ ایک میں کم۔ پھر دونوں کی الگ الگ دو گٹھریاں باندھ لیں۔ یہ تمام کام اُس نے اس اطمینان اور سکون کے ساتھ کیا، گویا اس میں اُس کے لیے کوئی انوکھی بات نہ تھی۔

پھر اچانک اُسے کچھ خیال آیا۔ اُس نے اپنی عبا اُتار ڈالی اور اسے بھی گٹھری کے اندر رکھ دیا۔

اب وہ اُٹھا اور ابنِ ساباط کے قریب گیا:

''میرے دوست، تمہارے چہرے کی پژمردگی سے معلوم ہوتا ہے کہ تم صرف تھکے ہوئے ہی نہیں ہو بلکہ بھوکے بھی ہو۔ بہتر ہوگا کہ چلنے سے پہلے دودھ کا ایک پیالہ پی لو۔ اگر تم چند لمحے انتظار کر سکو تو مَیں دودھ لے آؤں۔'' اُس نے کہا، جبکہ اس کے پرشکوہ چہرہ پر بدستور مسکراہٹ کی دلآویزی موجود تھی۔ ممکن نہ تھا کہ اس مسکراہٹ سے انسانی قلب کے تمام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اضطراب محو نہ ہو جائیں۔

قبل اس کے کہ ابنِ ساباط جواب دے، وہ تیزی کے ساتھ لوٹا، اور باہر نکل گیا۔

اب ابنِ ساباط تنہا تھا۔ لیکن تنہا ہونے پر بھی اس کے قدموں میں حرکت نہ ہوئی۔ اجنبی کے طرزِ عمل میں کوئی بات ایسی نہ تھی جس سے اس کے اندر خوف پیدا ہوتا۔ وہ صرف متحیر اور مبہوت تھا۔

اجنبی کی ہستی اور اس کا طور طریقہ ایسا عجیب و غریب تھا کہ جب تک وہ موجود رہا، ابنِ ساباط کو تحیر و تاثر نے سوچنے سمجھنے کی مہلت ہی نہ دی۔ اجنبی کی شخصیت کی تاثیر سے اس کی دماغی شخصیت مغلوب ہوگئی تھی۔ لیکن اب وہ تنہا ہوا، تو آہستہ آہستہ اُس کا دماغ اپنی اصلی حالت پر واپس آنے لگا۔ یہاں تک کہ تمام دماغی خصائل پوری طرح اُبھر آئے، اور وہ اُسی روشنی میں معاملات کو دیکھنے لگا جس روشنی میں دیکھنے کا ہمیشہ سے عادی تھا۔

وہ جب اجنبی کا متبسم چہرہ اور دلنواز صدائیں یاد کرتا، تو شک اور خوف کی جگہ اس کے اندر ایک ایسا ناقابلِ فہم جذبہ پیدا ہو جاتا جو آج تک اُسے کبھی محسوس نہیں ہوا تھا۔ لیکن پھر جب وہ سوچتا کہ اس تمام معاملہ کا مطلب کیا ہے؟ اور یہ شخص ہے کون؟ تو اس کی عقل حیران رہ جاتی اور کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اس نے اپنے دل میں کہا "یہ تو قطعی ہے کہ یہ شخص اس مکان کا مالک نہیں ہے۔ مکان کے مالک کبھی چوروں کا اس طرح استقبال نہیں کیا کرتے... مگر پھر یہ شخص ہے کون؟..."

اچانک ایک نیا خیال اُس کے اندر پیدا ہوا۔ وہ ہنسا "استغفراللہ" میں بھی کیا احمق ہوں۔ یہ بھی کوئی سوچنے اور حیران ہونے کی بات تھی؟ معاملہ بالکل صاف ہے۔ تعجب ہے مجھے پہلے کیوں خیال نہیں ہوا؟ یقیناً یہ بھی کوئی میرا ہی ہم پیشہ آدمی ہے، اور اِسی نواح میں رہتا ہے۔ اتفاقات نے آج ہم دونوں چوروں کو ایک ہی مکان میں جمع کر دیا۔ چونکہ یہ اسی نواح کا آدمی ہے، اس لیے اس مکان کے تمام حالات سے واقف ہوگا۔ اُسے معلوم ہوگا کہ آج مکان رہنے والوں سے خالی ہے اور بہ اطمینان کام کرنے کا موقع ہے۔ اسی لیے وہ روشنی کا سامان ساتھ لے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کر آیا۔ لیکن جب دیکھا کہ مَیں پہلے سے پہنچا ہوا ہوں تو آمادہ ہو گیا کہ میرا ساتھ دے کر ایک حصہ کا حقدار بن جائے..."

وہ ابھی سوچ رہا تھا کہ دروازہ کھلا، اور اجنبی ایک لکڑی کا بڑا پیالہ ہاتھ میں لیے نمودار ہو گیا۔

"یہ لو، مَیں تمہارے لیے دودھ لے آیا ہوں۔ اسے پی لو۔ یہ بھوک اور پیاس، دونوں کے لیے مفید ہوگا۔" اُس نے کہا، اور پیالہ ابنِ ساباط کو پکڑا دیا۔ ابنِ ساباط واقعی بھوکا پیاسا تھا، بلا تامل منہ کو لگا لیا اور ایک ہی مرتبہ میں ختم کر دیا۔

اب اُسے معاملہ کی فکر ہوئی۔ اتنے دیر کے وقفہ نے اُس کی طبیعت بحال کر دی تھی۔

"دیکھو، اگرچہ میں تم سے پہلے یہاں پہنچ چکا تھا اور ہاتھ لگا چکا تھا، اور اس لیے ہم لوگوں کے قاعدہ کے بموجب تمہارا کوئی حق نہیں، لیکن تمہاری ہوشیاری اور مستعدی دیکھ لینے کے بعد مجھے کوئی تامل نہیں کہ تمہیں بھی اس مال میں شریک کر لوں۔ اگر تم پسند کرو گے تو مَیں ہمیشہ کے لیے تم سے معاملہ کر لوں گا۔ لیکن دیکھو، یہ میں کہے دیتا ہوں کہ آج جو کچھ بھی یہاں سے لے جائیں گے، اُس میں تم برابر کا حصہ نہیں پا سکتے، کیونکہ دراصل آج کا کام میرا ہی کام تھا۔" اُس نے صاف آواز میں کہا۔ اس کی آواز میں اب تاثر نہیں تھا، تحکم تھا۔

اجنبی مسکرایا۔ اُس نے ابنِ ساباط پر ایک ایسی نظر ڈالی جو اگرچہ شفقت و مہر سے خالی نہ تھی، لیکن اس کے علاوہ بھی اُس میں کوئی چیز تھی۔ لیکن ابنِ ساباط سمجھ نہ سکا۔ اُس نے خیال کیا۔ شاید یہ شخص اس طریقِ تقسیم پر قانع نہیں ہے۔ اچانک اُس کی آنکھوں میں اُس کی خوفناک مجرمانہ درندگی چمک اُٹھی۔ وہ غصہ سے مضطرب ہو کر کھڑا ہو گیا:

"بے وقوف، چپ کیوں ہے؟ یہ نہ سمجھنا کہ دودھ کا ایک پیالہ پلا کر اور چکنی چپڑی باتیں کر کے تم مجھے احمق بنا لو گے۔ تم نہیں جانتے، میں کون ہوں؟ مجھے کوئی احمق نہیں بنا سکتا۔ مَیں ساری دُنیا کو احمق بنا چکا ہوں۔ بولو۔ اس پر راضی ہو یا نہیں؟ اگر نہیں ہو تو..."

لیکن ابھی اُس کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ اجنبی کے لب متحرک ہوئے۔ اب بھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اُس کے لبوں سے اس کی مسکراہٹ نہیں ہٹی تھی:

''میرے عزیز دوست! کیوں بلاوجہ اپنی طبیعت آزردہ کرتے ہو؟ آؤ، یہ کام جلد نپٹالیں جو ہمارے سامنے ہے۔ دیکھو، مَیں نے دو گٹھریاں باندھ لی ہیں۔ ایک چھوٹی ہے، ایک بڑی ہے۔ تمہارا ایک ہاتھ ہے اس لیے تم زیادہ بوجھ نہیں سنبھال سکتے۔ لیکن میں دونوں ہاتھوں سے سنبھال لوں گا۔ چھوٹی گٹھری تم اُٹھا لو۔ بڑی میں اُٹھا لیتا ہوں۔ باقی رہا میرا حصہ جس کے خیال سے تمہیں اتنی آزردگی ہوئی ہے، تو میں بھی نہیں چاہتا، اس وقت اُس کا فیصلہ کراؤں۔ تم نے کہا ہے کہ تم ہمیشہ کے لیے مجھ سے معاملہ کر سکتے ہو۔ مجھے بھی ایسا ہی معاملہ پسند ہے۔ میں چاہتا ہوں تم ہمیشہ کے لیے مجھ سے معاملہ کر لو۔''

''ہاں، اگر یہ بات ہے تو پھر سب کچھ ٹھیک ہے۔ تمہیں ابھی معلوم نہیں میں کون ہوں؟ پورے ملک میں تمہیں مجھ سے بہتر کوئی سردار نہیں مل سکتا۔'' اُس نے بڑی گٹھری کے اُٹھانے میں اجنبی کو مدد دیتے ہوئے کہا۔

یہ گٹھری اس قدر بھاری تھی کہ ابنِ ساباط اپنی حیرانی نہ چھپا سکا۔ وہ اگرچہ اپنے نئے رفیق کی زیادہ جرأت افزائی کرنا پسند نہیں کرتا تھا، پھر بھی اُس کی زبان سے بے اختیار نکل گیا۔

''دوست، تم دیکھنے میں تو بڑے دبلے پتلے ہو، لیکن بوجھ اُٹھانے میں بڑے مضبوط نکلے۔'' ساتھ ہی اس نے اپنے دل میں کہا ''یہ جتنا مضبوط ہے، اُتنا عقلمند نہیں ہے، ورنہ اپنے حصے سے دست بردار نہ ہو جاتا۔ اگر آج یہ احمق نہ مل جاتا تو مجھے سارا مال چھوڑ کر صرف ایک دو تھانوں پر قناعت کر لینی پڑتی۔''

اب ابنِ ساباط نے اپنی گٹھری اُٹھائی جو بہت ہی ہلکی تھی، اور دونوں باہر نکلے۔ اجنبی کی پیٹھ جس میں پہلے سے خم موجود تھا، اب گٹھری کے بوجھ سے بالکل ہی جھک گئی تھی۔ رات کی تاریکی میں اتنا بھاری بوجھ اُٹھا کر چلنا نہایت دشوار تھا۔ لیکن ابنِ ساباط کو قدرتی طور پر جلدی تھی۔ وہ بار بار حاکمانہ انداز سے اصرار کرتا کہ تیز چلو۔ اور چونکہ خود اُس کا بوجھ بہت ہلکا تھا، اس لیے خود تیز چلنے میں کسی طرح کی دشواری محسوس نہیں کرتا تھا۔ اجنبی تعمیل حکم کی پوری کوشش کرتا،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیکن اتنا بھاری بوجھ اُٹھا کر دوڑنا انسانی طاقت سے باہر تھا۔ اس لیے پوری کوشش کرنے پر بھی زیادہ تیز نہیں چل سکتا تھا۔ کئی مرتبہ ٹھوکریں لگیں، بار ہا بوجھ گرتے گرتے رہ گیا۔ ایک مرتبہ اتنی سخت چوٹ کھائی کہ قریب تھا گر جائے پھر بھی اُس نے رُکنے یا ستانے کا نام نہیں لیا۔ گرتا پڑتا اپنے ساتھی کے ساتھ بڑھتا ہی رہا۔

لیکن ابنِ ساباط اس پر بھی خوش نہ تھا۔ اس نے پہلے تو ایک دو مرتبہ تیز چلنے کا حکم دیا۔ پھر بے تامل گالیوں پر اُتر آیا۔ ہر لمحہ کے بعد ایک سخت گالی دیتا اور کہتا تیز چلو۔ اتنے میں جسر (پُل) آیا۔ یہاں چڑھائی تھی۔ جسم کمزور اور تھکا ہوا، بوجھ بیحد بھاری؛ اجنبی سنبھل نہ سکا اور بے اختیار گر پڑا۔ ابھی وہ اُٹھنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ اوپر سے ایک سخت لات پڑی۔ یہ ابنِ ساباط کی لات تھی۔ اس نے غضبناک ہو کر کہا: ''کتے کے بیٹے! اگر اتنا بوجھ سنبھال نہیں سکتا تھا تو لاد کر لایا کیوں؟'' اجنبی ہانپتا ہوا اُٹھا۔ اس کے چہرہ پر درد و شکایت کی جگہ شرمندگی کے آثار پائے جاتے تھے۔ اُس نے فوراً گٹھری اُٹھا کر پیٹھ پر رکھی اور پھر روانہ ہو گیا۔

اب یہ دونوں شہر کے کنارے ایک ایسے حصہ میں پہنچ گئے جو بہت ہی کم آباد تھا۔ یہاں ایک ناتمام عمارت کا پرانا اور شکستہ احاطہ تھا۔ ابنِ ساباط اس احاطہ کے ایک جانب پہنچ کر رُک گیا، اور اجنبی سے کہا یہیں بوجھ اُتار دو۔ پھر خود کود کر اندر گیا اور اجنبی نے باہر سے دونوں گٹھریاں اندر پھینک دیں۔ اس کے بعد اجنبی بھی کود کر اندر ہو گیا۔ اور دونوں عمارت کے اندرونی حصہ میں پہنچ گئے۔ اس عمارت کے نیچے ایک پرانا سرداب (تہ خانہ) تھا جس میں ابنِ ساباط نے قید خانے سے نکل کر پناہ لی تھی۔ لیکن اس وقت وہ سرداب میں نہیں اُترا۔ وہ نہیں چاہتا تھا اجنبی پر ابھی اس درجہ اعتماد کرے کہ اپنا اصلی محفوظ مقام دکھلا دے۔

جس جگہ یہ دونوں کھڑے تھے، دراصل ایک ناتمام ایوان تھا یا تو اس پر پوری چھت پڑی ہی نہ تھی، یا پڑی تھی تو امتدادِ وقت سے شکستہ ہو کر گر پڑی تھی۔ ایک طرف بہت سے پتھروں کا ڈھیر تھا۔ ابنِ ساباط انہی پتھروں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ دونوں گٹھریاں سامنے دھری تھیں۔ ایک گوشہ میں اجنبی کھڑا ہانپ رہا تھا۔ کچھ دیر تک خاموشی رہی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یکا یک اجنبی بڑھا اور ابنِ ساباط کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اب رات ختم ہونے پر تھی۔ پچھلی پہر کا چاند درخشندہ تھا۔ کھلی چھت سے اس کی دھیمی اور ظلمت آلود شعاعیں ایوان کے اندر پہنچ رہی تھیں۔ ابنِ ساباط دیوار کے سائے میں تھا۔ لیکن اجنبی جو اُس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تھا، ٹھیک چاند کے مقابل تھا، اس لیے اُس کا چہرہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ابنِ ساباط نے دیکھا کہ تاریکی میں ایک درخشاں چہرہ، ایک نورانی تبسم، ایک پراسرار اندازِ نگاہ کی دلآویزی سامنے ہے۔

''میرے عزیز دوست اور رفیق!'' اجنبی نے اپنی اسی دلنواز اور شیریں آواز میں جو دو گھنٹہ پہلے ابنِ ساباط کو بے خود کر چکی تھی، کہنا شروع کیا ''میں نے اپنی خدمت پوری کر لی ہے۔ اب مَیں تم سے رخصت ہوتا ہوں۔ اس کام کے کرنے میں مجھ سے جو کمزوری اور سستی ظاہر ہوئی اور اس کی وجہ سے بار بار تمھیں پریشان خاطر ہونا پڑا، اُس کے لیے میں بہت شرمندہ ہوں اور تم سے معافی چاہتا ہوں۔ مجھے اُمید ہے تم معاف کر دو گے۔ اس دُنیا میں ہماری کوئی بات بھی خدا کے کاموں سے اس قدر ملتی جلتی نہیں ہے جس قدر یہ بات کہ ہم ایک دوسرے کو معاف کر دیں اور بخش دیں۔ لیکن قبل اس کے کہ میں تم سے الگ ہوں، تمھیں بتلا دینا چاہتا ہوں کہ مَیں وہ نہیں ہوں، جو تم نے خیال کیا ہے۔ مَیں اُسی مکان میں رہتا ہوں جہاں آج تم سے ملاقات ہوئی تھی، اور تم نے میری رفاقت قبول کر لی تھی۔ میری عادت ہے کہ رات کو تھوڑی دیر کے لیے اُس کمرے میں جایا کرتا ہوں جہاں تم بیٹھے تھے۔ آج آیا تو دیکھا، تم اندھیرے میں بیٹھے ہو اور تکلیف اُٹھا رہے ہو۔ تم میرے گھر میں عزیز مہمان تھے۔ افسوس! میں آج اس سے زیادہ تمھاری تواضع اور خدمت نہ کر سکا۔ تم نے میرا مکان دیکھ لیا ہے۔ آئندہ جب کبھی تمھیں ضرورت ہو، تم بلا تکلف اپنے رفیق کے پاس چلے آ سکتے ہو۔ خدا کی سلامتی اور برکت ہمیشہ تمھارے ساتھ رہے۔''

یہ کہا اور آہستگی سے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر مصافحہ کیا، اور تیزی کے ساتھ نکل کر روانہ ہو گیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اجنبی خود تو روانہ ہو گیا، لیکن ابنِ ساباط کو ایک دوسرے ہی عالم میں پہنچا دیا۔ اب وہ مبہوت اور مدہوش تھا۔ اُس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ وہ اُسی طرف تک رہی تھیں جس طرف سے اجنبی روانہ ہوا تھا، لیکن معلوم نہیں اُسے کچھ سوجھائی بھی دیتا تھا یا نہیں؟

دوپہر ڈھل چکی ہے۔ بغداد کی مسجدوں سے جوق در جوق نمازی نکل رہے ہیں۔ دوپہر کی گرمی نے امیروں کو تہ خانوں اور غریبوں کو دیواروں کے سائے میں بٹھا دیا تھا۔ اب دونوں نکل رہے ہیں۔ ایک تفریح کے لیے، دوسرا مزدوری کے لیے۔ لیکن ابنِ ساباط اس وقت تک وہیں بیٹھا ہے جہاں صبح بیٹھا تھا۔ رات والی دونوں گٹھریاں سامنے پڑی ہیں۔ اور اس کی نظریں اس طرح اُن میں گڑی ہوئی ہیں، گویا اُن کی شکنوں کے اندر اپنے رات والے رفیق کو ڈھونڈ رہا ہے۔

بارہ گھنٹے گزر گئے، لیکن جسم اور زندگی کی کوئی ضرورت بھی اُسے محسوس نہیں ہوئی۔ وہ بھوک جس کی خاطر اُس نے اپنا ایک ہاتھ کٹوا دیا تھا، اب اسے نہیں ستاتی۔ وہ خوف جس کی وجہ سے سورج کی روشنی اُس کے لیے دُنیا کی سب سے زیادہ نفرت انگیز چیز ہوگئی تھی، اب اُسے محسوس نہیں ہوتا۔ اُس کے دماغ کی ساری قوت صرف ایک نقطہ میں سمٹ آئی ہے اور وہ رات والے عجیب وغریب ''اجنبی'' کی صورت ہے۔ وہ خود تو اس کی نظروں سے اوجھل ہوگئی، مگر اُسے ایک ایسے عالم کی جھلک دکھا دی، جو اب تک اُس کی نگاہوں سے پوشیدہ تھا۔

اُس کی ساری زندگی گناہ اور سیہ کاری میں بسر ہوئی تھی، اُس نے انسانوں کی نسبت جو کچھ دیکھا سنا تھا، وہ یہی تھا کہ خود غرضی کا پتلا اور نفس پرستی کی مخلوق ہے۔ وہ نفرت سے منہ پھیر لیتا ہے، بے رحمی سے ٹھکرا دیتا ہے، سخت سے سخت سزائیں دیتا ہے؛ لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ محبت بھی کرتا ہے، اور اس میں فیاضی، بخشش، اور قربانی کی بھی روح ہو سکتی ہے۔ بچپن میں اُس نے بھی خدا کا نام سنا تھا اور لوگوں کو خدا پرستی کرتے دیکھا تھا۔ لیکن جب زندگی کی کشاکش کا میدان سامنے کھلا تو اس کا عالم ہی دوسرا تھا۔ اُس نے قدم اُٹھا دیا اور حالات کی رفتار جس طرف لے گئی، بڑھے گیا۔ نہ تو خود اسے کبھی مہلت ملی کہ خدا پرستی کی طرف متوجہ ہوتا، اور نہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انسانوں نے کبھی اس کی ضرورت محسوس کی کہ اُسے خدا سے آشنا کرتے۔ جوں جوں اس کی شقاوت بڑھتی گئی، سوسائٹی اپنی سزا و عقوبت کی مقدار بھی بڑھاتی گئی۔ سوسائٹی کے پاس اُس کی شقاوت کے لیے بے رحمی تھی، اس لیے یہ بھی دُنیا کی ساری چیزوں میں سے صرف بے رحمی ہی کا خوگر ہو گیا۔

لیکن اب اچانک اُس کے سامنے سے پردہ ہٹ گیا۔ آسمان کے سورج کی طرح محبت کا بھی ایک سورج ہے۔ یہ جب چمکتا ہے تو روح اور دل کی ساری تاریکیاں دور ہو جاتی ہیں۔ اب یکا یک اس سورج کی پہلی کرن ابنِ ساباط کے دل کے تاریک گوشوں پر پڑی، اور وہ بہ یک دفعہ تاریکی سے نکل کر روشنی میں آ گیا۔

اجنبی کی شخصیت اپنی پہلی ہی نظر میں اُس کے دل تک پہنچ چکی تھی، لیکن وہ جہالت و گمراہی سے اس کا مقابلہ کرتا رہا۔ اور حقیقت کے فہم کے لیے تیار نہیں ہوا۔ لیکن جونہی اجنبی کے آخری الفاظ نے وہ پردہ ہٹا دیا جو اس نے اپنی آنکھوں پر ڈال لیا تھا، حقیقت اپنی پوری شانِ تاثیر کے ساتھ بے نقاب ہوگئی، اور اب اس کی طاقت سے باہر تھا کہ اس تیر کے زخم سے سینہ بچا لے جاتا۔

اُس نے اپنی جہالت سے پہلے خیال کیا تھا، اجنبی بھی میری ہی طرح کا ایک چور ہے، اور اپنا حصہ لینے کے لیے میری رفاقت و اعانت کر رہا ہے۔ اُس کا ذہن یہ تصور ہی نہیں کر سکتا تھا کہ بغیر غرض اور انتفاع کے ایک انسان دوسرے کے ساتھ اچھا سلوک کر سکتا ہے۔ لیکن جب اجنبی نے چلتے وقت بتلایا کہ وہ چور نہیں، بلکہ اُسی مکان کا مالک ہے جس مکان کا مال و متاع غارت کرنے کے لیے وہ گیا تھا، تو اُسے ایسا محسوس ہوا، جیسے یکا یک ایک بجلی آسمان سے گر پڑی:

''یہ چور نہیں تھا۔ مکان کا مالک تھا۔ لیکن اس نے چور کو پکڑنے اور سزا دلا دینے کی جگہ اس کے ساتھ کیا سلوک کیا؟'' اس ''کیا سلوک کیا؟'' کا جواب اس کی روح کے لیے ناسور اور اس کے دل کے لیے ایک دہکتا ہوا انگارہ تھا۔ وہ جس قدر سوچتا، روح کا زخم گہرا ہوتا جاتا،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور دل کی تپش بڑھتی جاتی۔ اس تمام عرصہ میں اجنبی کے ساتھ جو کچھ گزرا تھا، اُس کا ایک ایک واقعہ، ایک ایک حرف یاد کرتا، اور ہر بات کی یاد کے ساتھ ایک تازہ زخم کی چبھن محسوس کرتا۔ جب ایک مرتبہ حافظہ میں یہ سرگزشت ختم ہو جاتی تو پھر نئے سرے سے یاد کرنا شروع کر دیتا، اور آخر تک پہنچا کر پھر ابتدا کی طرف لوٹتا۔ ''مَیں اُس کے یہاں چوری کرنے کے لیے گیا تھا۔ مَیں چور تھا۔ مَیں اُس کا مال و متاع غارت کرنا چاہتا تھا۔ مَیں نے اُسے بھی چور سمجھا۔ اُسے گالیاں دیں۔ بے رحمی سے ٹھوکر لگائی --- مگر اُس نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا؟'' ہر مرتبہ اس آخری سوال کا جواب سوچتا اور پھر یہی سوال دہرانے لگتا۔

سورج ڈوب رہا تھا۔ بغداد کی مسجدوں کے مناروں پر مغرب کی اذان کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ ابنِ ساباط بھی اپنے غیر آباد گوشہ میں اُٹھا۔ چادر جسم پر ڈالی اور بغیر کسی جھجک کے باہر نکل گیا۔ اب اس کے دل میں خوف نہیں تھا۔ کیونکہ خوف کی جگہ ایک دوسرے ہی جذبہ نے لے لی تھی۔

وہ کرخ کے اُسی حصہ میں پہنچا جہاں رات گیا تھا۔ رات والے مکان کے پہچاننے میں اسے کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ مکان کے پاس ہی ایک لکڑہارے کا جھونپڑا تھا۔ یہ اُس کے پاس گیا اور پوچھا:

''یہ جو سامنے بڑا سا احاطہ ہے، اس میں کون تاجر رہتا ہے؟''

''تاجر'' بوڑھے لکڑہارے نے تعجب کے ساتھ کہا ''معلوم ہوتا ہے تم یہاں کے رہنے والے نہیں ہو۔ یہاں تاجر کہاں سے آیا؟ یہاں تو شیخ جنید بغدادی رہتے ہیں۔''

ابنِ ساباط اس نام کی شہرت سے بے خبر نہ تھا لیکن صورت آشنا نہ تھا۔

ابنِ ساباط مکان کی طرف چلا۔ رات کی طرح اس وقت بھی دروازہ کھلا تھا۔ یہ بے تامل اندر چلا گیا۔ سامنے وہی رات والا ایوان تھا۔ یہ آہستہ آہستہ بڑھا اور دروازہ کے اندر نگاہ ڈالی۔ وہی رات والی چٹائی بچھی تھی۔ رات والا تکیہ ایک جانب دھرا تھا۔ تکیہ سے سہارا لگائے عجیب ''اجنبی'' بیٹھا تھا۔ تیس چالیس آدمی سامنے تھے۔ واقعی ''اجنبی'' تاجر نہیں تھا، شیخ جنید

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بغدادیؒ تھے۔

اتنے میں عشاء کی اذان ہوئی، لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ جب سب لوگ جا چکے تو شیخ بھی اُٹھے، جونہی اُنہوں نے دروازہ کے باہر قدم رکھا، ایک شخص بے تابانہ بڑھا اور قدموں پر گر گیا۔ یہ ابنِ ساباط تھا۔ اس کے دل میں سمندر کا تلاطم بند تھا۔ آنکھوں میں جو کبھی تر نہیں ہوئی تھیں دجلہ کی سوتیں بھر گئی تھیں۔ دیر تک رُکی رہیں مگر اب نہیں رُک سکتی تھیں۔ آنسوؤں کا سیلاب آ جائے تو پھر دل کی کونسی کثافت ہے جو باقی رہ سکتی ہے؟

شیخ نے شفقت سے اُس کا سر اُٹھایا۔ یہ کھڑا ہو گیا مگر زبان نہ کھل سکی اور اب اس کی ضرورت بھی کیا تھی؟ جب نگاہوں کی زبان کھل جاتی ہے تو منہ کی زبان کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

اس واقعہ پر کچھ عرصہ گزر چکا ہے۔ شیخ احمد ابنِ ساباط کا شمار سیّد الطائفہ کے حلقۂ ارادت کے اُن فقراء میں ہے جو سب میں پیش پیش ہیں۔ شیخ کہا کرتے ہیں۔ ''ابنِ ساباط نے وہ راہ لمحوں میں طے کر لی جو دوسرے برسوں میں بھی طے نہیں کر سکتے۔''

ابنِ ساباط کو ۴۰ برس تک دُنیا کی دہشت انگیز سزائیں نہ بدل سکیں، مگر محبت اور قربانی کے ایک لمحہ نے چور سے اہل اللہ بنا دیا۔

[الہلال، ۱۵ر جولائی ۱۹۲۷ء اور ۲۲ر جولائی ۱۹۲۷ء]

© rasailojaraid.com